المنار

Amatul Quddous
B

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

جلد (۳) تعلیم الاسلام کالج لاہور شمارہ (۲)

نومبر - دسمبر ۱۹۵۲ء

مدیر اعلیٰ
شیخ محبوب عالم خالد
بی اے (آنرز) ایم اے

مدیران
بشیر احمد رفیق
عبداللطیف

(فہرست)

اصول تنقید	عبداللطیف	۲
دو غزلیں	سعد درانی	۶
عزم	سمیع اللہ قریشی	۷
اردو تنقید پر اک نظر	ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم - اے - اچ - ڈی -	۸
ساقی	قاصد ظریف	۱۰
تاریخ اسلام کے متعلق بعض اصولی نظریے	پروفیسر بشارت الرحمان ایم - اے	۱۱
مکتوبات نبوی صلعم پر اک نظر	جنید ہاشمی بی - اے	۱۴
بندگان خدا	محمود ایاز	۱۶

پبلشرز جنید ہاشمی نے دستکاری پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبداللطیف

اُصول تنقید

(مضمون نگار کے ہر نظریئے سے اتفاق ضروری نہیں مدیر)

جہاں تک صحیح فن تنقید کا تعلق ہے اِس موضوع پر بیشتر کتابیں دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انسانی ذہن بالعموم اور مشرقی ذہنیتیں بالخصوص شخصیت پرست واقع ہوئی ہیں اور دنیائے علم و ادب میں جسے ہم تنقیدی مواد کہتے یا سمجھتے ہیں۔ اسکا اکثر و بیشتر حصّہ توصیف یا تنقیص پر مشتمل ہے۔ صحیح تنقید نہایت ہی دقتِ نظر اور وسعت مطالعہ کے باوجود بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اد نظے سے ادنٰے تخلیق بھی نہایت ہی بلند اور دقیق اندازِ نقد و نظر کی متقاضی ہوتی ہے علی الخصوص موجودہ دَور میں جبکہ تنقید ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور علوم جدیدہ نے اپنے مخصوص انداز میں اسکے تمام دیرینہ اسالیب کو غیر معمولی طور پر متاثر کر رکھا تھا۔

ہمارے اُردو دان طبقہ نے شومئی قسمت سے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے اور اُردو زبان کے گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے علمی اور ادبی سرمائے میں ہمیں بہت کم کتابیں ایسی میسر آتی ہیں جنہیں بجا طور پر تنقیدی کہا جا سکے۔ مولانا حالی اور شبلی نعمانی یا جامعہ عثمانیہ اور ندوہ والوں نے ضرور اس سلسلے میں کسی قدر مواد بہم پہنچایا ہے۔ جو یقیناً قابلِ قدر ہے مگر یونکہ فن مغرب کا ہے جدید ادبی تقاضوں اور اسالیب نقد و انتقاد کا ساتھ نہیں دے سکتا! البتہ مجنوں گورکھپوری ممتاز حسین پروفیسر سرور اور کلیم الدین احمد۔ احتشام حسین عزیز احمد۔ ڈاکٹر زور محمد حسین قادری جعفر علی خاں اثر اور نیاز فتح پوری نے جدید اسلوبِ تنقید کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی حد تک زبان اُردو کی تہی دامنی کا ازالہ کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اسقدر قلیل ہے کہ اس مبسوط فن کے پیش لفظ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا اور اسپر مستزاد مشرق کی شخصیت پرستی نے اس بیباک اور بے لاگ اندازِ فکر و نظر کی جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اُسکے پیشِ نظر ابھی کئی سالوں تک اس فن کا مستقبل کچھ اچھا نظر نہیں آتا! اکثر کا انداز مصالحانہ ہے۔

کسی مصنف یا اُس کی تصنیف پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں بہت سی باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً مصنف کا وطن اُس کی آب و ہوا جغرافیائی اور سیاسی حالات معاشی و عمرانی فضا نفسیاتی پس منظر، ماحول اور وقت کے مخصوص تاثرات مصنف کے محرکات اور وجہ تصنیف وغیرہ۔ جو یقیناً ایک نہایت ہی صبر آزما کام ہے جس کے لئے ایک مخصوص پختگیٔ فکر اور وسیع تفحص و تفکر کی ضرورت ہے۔ مگر سوء اتفاق سے ہمارے ہاں مصنف بننے کا شوق بہت جلد شروع ہو جاتا ہے۔ جسکی بنا پر چند مفلوج اور مدقوق قسم کے پریشان و پراگندہ افکار کو نہایت ہی دیدہ زیب سرورق سے مزین کتاب کی صورت دیکر ہر طرف ایک تحسین طلب انداز سے دیکھا جاتا ہے یا پھر تنقید پر چند اِدھر اُدھر کی رفتہ کتابیں اور سطحی قسم کے تذکرے پڑھنے کے بعد متعدد اقتباسات کو مجتمع کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت دیدی جاتی ہے

چنانچہ اُردو ادب کی تنقیدی کتب میں سے بہت زیادہ کتابیں ایسی نکلیں گی۔ جو آبِ حیات۔ شعر الہند، گل رعنا، روحِ تنقید اور خمخانۂ جاوید وغیرہ ایسے دفاترِ پارینہ کے استفادہ یا ملخص سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور پھر ان تنقیدوں پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں۔ وہ معاذ اللہ بد سے بتدریج بدتر اور بدترین ہوتی چلی جاتی ہیں۔

مغرب کا مشہور نامقبول فلسفی ادیب آسکر وائلڈ ایک جگہ کہتا

ہے کہ کسی تصنیف کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بداخلاقی کا بالکل لایعنی سی بات ہے۔ کیونکہ ہماری تمام تر قدریں اس قدر محدود اور اعتباری ہیں کہ بقول پاسکل طول بلد عرض بلد کے ساتھ ساتھ ہمارے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مرورِ ایام نے کئی نیکیوں کو برائیاں اور کئی برائیوں کو نیکیاں بنا دیا۔ لہذا کسی تصنیف کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے۔ کہ وہ ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بری؟

لیکن اگر کسی تصنیف کی محض ایک تصنیف ہی کی حیثیت سے اچھائی اور برائی جانچی جائے تو بھی اچھائی اور برائی کا کوئی معیار وضع کرنا پڑیگا۔ جو یقیناً اضافی ہوگا۔ اور اضافی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی بجائے صرف ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی ہی کا اظہار ہو سکتا ہے۔ جو غالباً اس قدر ادنیٰ سی چیز ہے کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ صورت میں بھی تنقید نہیں کہلا سکتی کیونکہ تنقید ایک مستقل فن ہے۔ اور فن درحقیقت ہمیشہ عالمگیر ہوتا ہے بخلاف اس کے ذاتی رائے خواہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو عالمگیر نہیں ہو سکتی! گوئٹے (GOETHE) اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ "حقیقت یا صداقت ایک ہی ہے باوجودیکہ تمام اضافیت بھی صحیح ہے"۔

یہ بات پلاٹینس اور ابن عربی کے مخالفین کو معلوم نہیں کیسی محسوس ہو! مگر دنیائے انتقاد میں دانستہ یا نادانستہ طور پر اسے ایک اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی ادب اور فن سے متعلق تمام علمی اور فروعی نظریات سے ہٹ کر اگر غور کیا جائے تو درحقیقت تمام علوم و فنون کی ابتداء معیشت کی ضروریات سے ہوتی ہے مگر یہ ضروریات پورا کرنے کے بعد جیسا کہ فریڈرک نٹشے (NIETZSCHE) کا خیال ہے ہر علم و فن ایک آزاد حیثیت اختیار کر کے علم برائے علم رہ کر ہی ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن علم برائے علم کے جھگڑے سے ایک خاص الجھن عبادر ہوتی ہے جو آگے جا کر "ادب برائے ادب"، "ادب برائے افادیت"، "ادب برائے زندگی" اور معلوم نہیں کیا کیا برائے کیا کیا بن جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ایک سرسری مگر اساسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ دراصل بالواسطہ یا بلاواسطہ ادب، فن، علم بلکہ زیادہ تر بھی مرئی یا غیر مرئی [illegible] زندگی سے چنانچہ حیاتیاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ادب برائے ادب یا ادب برائے افادہ صرف [illegible] یعنی [illegible] محسوس

ہوتے ہیں ورنہ خواہ ادب ہو خواہ افادہ، خواہ فن ہو خواہ علم ان میں سے کوئی چیز بھی قائم بالذات نہیں حتیٰ کہ انفرادی اعتبار سے میں اور آپ بھی قائم بالذات نہیں بلکہ زندگی ایک مستقل اور مسلسل جوہر ہے جس کے ہم سب اعراض ہیں اور جب ہماری یا کم از کم ہمارے علم و فن کی بجز ہمارے کوئی مستقل حیثیت ہے ہی نہیں تو ہماری تخلیقات برائے ادب کیسے ہو سکتی ہیں۔ یعنی ادب برائے ادب تو دراصل ادب برائے افادہ ہے۔ اور افادہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو برائے زندگی ہوتا ہے۔ یا زیادہ واضح صورت میں کم از کم یہ تو مسلمہ ہے کہ ہماری ہر تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ لہذا ادب برائے ادب کا بھی کوئی مقصد ہوگا۔ جسے حاصل کرنے کے بعد لازماً ادیب کو داخلی یا خارجی یا کم از کم معکوس صورت میں مسرت یا تسکین ہوتی ہوگی اور ہر مسرت برائے افادہ ضرور ہوتی ہے۔ اور افادیت کا کوئی تخیل بھی ایسا نہیں جو برائے زندگی نہ ہو! لہذا ادب کا مقصد بالواسطہ یا بلاواسطہ دراصل ادب، افادہ اور زندگی تینوں پر حاوی ہوتا ہے۔ جو اکثر اوقات تو شعوری طور پر ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی وجدان پرستوں کے نقطۂ نظر سے غیر شعوری بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے افلاطون اپنی کتاب "الجمہوریت" میں ایک جگہ کہتا ہے "مصور فقط یہ جانتا ہے۔ کہ تصویر اچھی بنے چنانچہ اس کی ذاتی اور عارضی غرضیں اس کے سامنے براہ راست نہیں آتیں"۔ گو میرے نزدیک بلا تخصیص ذاتی و عارضی اغراض بلاواسطہ صورت میں فنکار کے پیش نظر "فن برائے فن" کے سوا کوئی غرض ہوتی ہی نہیں ـــــ تو اس حقیقت عمومی کو پس منظر کی حیثیت دینے کے بعد البتہ ادب افادہ اور زندگی کے تصورات تقریباً ہر شخص کے انفرادی ہوتے ہیں جنہیں گوئٹے باوجود تمام صحیح مطلقیت کے اضافی تسلیم کرتا ہے۔ حالانکہ سب کے پس منظر میں حقیقت دراصل ایک ہی ہوتی ہے۔ یہیں سے تنقید اور ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی میں تمیز شروع ہوتی ہے۔ یعنی پسندیدگی و ناپسندیدگی محض اضافیت میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اور تنقید اس مطلق پس منظر کے اعتبار سے تصنیف کا جائزہ لیتی ہے۔ یا جہاں پسند و ناپسند کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ وہاں سے صحیح تنقید کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ بات صاف واضح ہے کہ ادب خیالات کی پیداوار ہے اور خیالات ([illegible]) غیر محسوس کہہ لیجئے گفتگو ہیں اور گفتگو کی دنیا تکرار سے معمور ہے۔ یعنی باتیں اگر دہرائی نہ جایا کریں تو اب تک سب ختم

ہو چکی ہوتیں لیکن اس کے برعکس یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ حسین سے حسین اور دلچسپ سے دلچسپ باتوں کی بھی مسلسل تکرار ذوقِ سماع کو ضائع کر دیتی ہے۔ اسی لئے ایک بلند پایہ ادیب نہ صرف باتوں کو دہراتا ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں یوں دہراتا ہے کہ وہ باتیں تقریباً اس کی اپنی محسوس ہوتی ہیں۔ جو نئی ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری قوتِ فکر اور احساسِ جمال دونوں کو تسکین بہم پہنچاتی ہیں ایسی تخلیق کو ہم جمیل تنوع (Aesthetical Originality) کہتے ہیں۔ مگر یہ کام صرف اہم نہیں بلکہ مشکل ترین بھی ہے۔ اس لئے تاریخِ ادبیات ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اکثر عمریں گزر جاتی ہیں اور ادیب صرف لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار طویل مدتوں کے بعد زمانہ کوئی ایسا غیر معمولی آدمی پیدا کرتا ہے جو فی الحقیقت ایک بلند فنکار ہوتا ہے لیکن ایک طرف تو اُس کے افکار انتہائی غیر معمولی۔ بلند اور منفرد ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُس کا اندازِ بیان مخصوص دلچسپ اور حسین ہوتا ہے اور دنیا میں عوام کو ہمیشہ تعداد کا فخر حاصل رہا ہے۔ لہٰذا کثیر التعداد لوگ تو کسی نادانستہ خوف کی بنا پر اُس کے غیر مانوس اندازِ فکر اور بظاہر ناقابلِ فہم خیالات کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اُن سے قدرے سنجیدہ طبقہ اُنہیں سنجیدگی سے محسوس کرتا ہے اور سنجیدگی ہی سے پارینہ قدروں کے نام پر رد کر دیتا ہے۔ ایک اور طبقہ نام نہاد روشن خیالوں کا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بزعمِ خود ہمیشہ رسمِ عوام کی زنجیر سے آزاد خیال کرتا ہے۔ اس لئے اپنے مخصوص رنگ میں وہ ادیب کے محض اندازِ بیان سے متاثر ہو کر یوں تنقید کرتا ہے کہ خیالات تو تمام غلط ہیں مگر ظالم اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ جھوٹ بھی سچ معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ تنقید ہے جو بالعموم آسکر وائلڈ پر کی جاتی ہے۔ آخر میں ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے۔ جو طبعاً بلند ہونے کے باوجود حالات و واقعات کی نامساعدت سے اُن بلندیوں تک پہنچ نہیں سکتا۔ لہٰذا وہ فوراً اپنے آپ کو اُس ادیب کی ذات میں (Project) منتقل کر کے اُسے بے اختیار داد دیتا ہے لیکن افسوس کہ یہ لوگ تعداد میں اسقدر تھوڑے ہوتے ہیں کہ جسے قبولِ عام کہتے ہیں۔ وہ اُس بے چارے آفاقی ادیب کو میسر آ نہیں سکتا۔ اُدھر اُس کے حریف اُس کے متعلق وہ اَن کہی کہتے ہیں کہ رہی سہی قبولیت بھی دم توڑ دیتی ہے چنانچہ کثرتِ رائے کو اگر نقد و نظر کا معیار قبول کر لیا جاتا۔ تو دنیا کے اہم ترین فنکار کبھی صاحبِ تخلیق ہی تسلیم نہ ہو سکتے۔ کیونکہ۔ دراصل عدم تقلید اور عام مذاق سے اجتناب ہی ایک زبردست انفرادیت اور بلند پایہ استعدادِ فنی کے آثار ہیں۔ جن میں اگر جمالیات کا صحیح احساس و ادراک شامل ہو جائے تو فنکار انتقاد کی سرحدوں سے بہت دُور نکل جاتا ہے۔ یعنی تنقید تحیر میں بدل جاتی ہے اور نقاد مداح کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک تنقید کا میدان دراصل غیر معیاری فن تک محدود ہے۔ جو بالعموم زندگی کے سطحی اور ناپائیدار تجربات کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر دنیا دار اسے وقتی جذبات کی گہما گہمی میں کسی طرزِ تخلیق کو چند پہلوؤں سے مزین کر کے شاہکار کا مقام دے ڈالتے ہیں۔ جس کی سماجی حیثیت چند لازوال شاہکاروں کو کچھ مدت کے لئے زاویۂ خمول میں ضرور ڈال دیتی ہے اور شاید جس سے متاثر ہو کر افلاطون نے کہہ دیا تھا۔ کہ "تخلیقات کی عمر بھی مختلف جانوروں کی طرح مختلف ہوتی ہے"۔ حالانکہ درحقیقت بلند اور صحیح تخلیقات زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہوتی ہیں۔ لیکن تخلیق و طرزِ تخلیق میں ان مشکلاتِ امتیاز کی بنا پر ہی شاید عظیم نقاد اپنے وقت کے بعد یا بلند فنکار اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے کے طور معیاری تخلیقات بجائے خود ایک المیہ ہوتی ہیں۔ اور فنکار زیادہ تر قنوطی حتیٰ کہ بلند آرٹ کے المیہ رجحانات کی اس عالمگیری سے متاثر ہو کر برگساں تو یہاں تک انتہا پسند ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح فن کا زندگی یعنی (Practical life) سے کوئی تعلق ہی تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ اُسکے الفاظ میں "کبھی کبھی فطرت بھول کر ایسے انسان پیدا کرتی ہے جو زندگی سے کچھ زیادہ الگ تھلگ رہ سکتے ہیں یہ علیحدگی کسی ارادی منطقی تحریک یا باقاعدہ غور و فکر اور فلسفہ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ فطری اور حواس و شعور کی ترکیب میں مضمر ہوتی ہے اگر یہ علیحدگی مکمل ہوتی اور روح کا احساس اور ادراک حرکت و عمل سے تعلق نہ رکھتا تو ایک ایسے آرٹسٹ کا ظہور ہوتا جس کی مثال آج تک دنیا نے نہ دیکھی ہوتی! لیکن یہ ممکن نہیں" (ترجمہ از کلیم الدین احمد۔ اُردو تنقید پر ایک نظر) یعنی دوسرے لفظوں میں آرٹسٹ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کے آلام (Acme) یا منتہائے حسیت سے گزر کر اُسے ایک ایسا نظریاتی پیکر بنا دیں جو وقتی اور عصری جذبات کی دنیا میں ایک چٹان کی حیثیت رکھتا ہو۔

اپنے نقطۂ نظر کی اس توضیح کے بعد میرے نزدیک صحیح آرٹ کا مقصد تمام افادی علاقوں رسمی اور سماجی پردوں غرضیکہ ہر اضافیت سے گزر کر ایک مطلق اور عالمگیر حقیقت تک پہنچنا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ

فنکار کی انفرادیت کا تنوع اور جمالیات کے تقاضے زیادہ سے زیادہ پورے ہو سکیں خواہ اسکے بعد روایات کی پرستار دنیا اُسے حقارت و نفرت کا مرکز ہی کیوں نہ بنا لے کیونکہ کم از کم اس وقت تو دنیا میں میرے نزدیک عمومی نامقبولی بلندی کی دلیل ہے اور قبولِ عام سطحیت و ذہنی افلاس کے مرادف! البتہ مُستثنیات ہمیشہ مستثنیات ہی رہتی ہیں۔ لہٰذا صحیح ادب ہمیشہ زندگی کے بنیادی اور پائیدار تجربات سے وابستہ ہوتا ہے۔ جو زندگی کی حدود کے اندر اندر استمراری یا (eternal) ہوتے ہیں
چنانچہ اس لحاظ سے جیسا کہ مشہور سائنس اور ریاضی دان آئن سٹائین کا خیال ہے کہ "سائنس بھی آرٹ کی ایک تخلیق ہے جس میں انسانی فطرت کے ایک پہلو کو پیش کیا گیا ہے" لیکن جو چیز جسقدر حقیقی اور واقعی ہے اُسی قدر غیر محسوس و غیر مشاہد بھی ہے اس لئے نطشے کا یہ خیال ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے کہ "آسمان اور زمین کے درمیان بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا اگر تھوڑا بہت احساس بھی ہوتا ہے۔ تو صرف آرٹسٹ کو" یا برگسان کے الفاظ میں "فطرت اور ہمارے درمیان ہی نہیں بلکہ ہمارے اور ہمارے شعور کے درمیان بھی ایک پردہ حائل ہے۔ جو عام لوگوں کیلئے دبیز لیکن آرٹسٹ کے لئے باریک اور شفاف ہوتا ہے"۔ لہٰذا اپنے عالمگیر اور غیر مرئی محسوسات کو جب فنکار مرئی کرنے لگتا ہے۔ تو آرٹ کا مقصد محض انفرادیت کا حصول ہوتا ہے چنانچہ فنکار اپنی تخلیقات میں ایسی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ جو صرف اُس کی ہوتی ہیں۔ اور کبھی لوٹ کر نہیں آتیں" اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے آرٹ داخلی (Subjective) اور خارجی (Objective) دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے —
اب مواد (Matter) اور اظہار (Expression) (Form) کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے یعنی پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ فنکار کا مواد عالمگیر اور پائیدار انسانی جذبات سے وابستہ ہے؟ لیکن فنِ لطیف چونکہ کسی خاص علم کا نام نہیں بلکہ اُس سے کسی خاص قسم کا عمل پیدا کرنے کا نام ہے جیسا کہ افلاطون کہتا ہے کہ "شاعر وہ نہیں جو شعر کہہ سکتا ہے بلکہ شاعر وہ ہے جو شعر کہتا ہے"۔ لہٰذا دوسرے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آرٹسٹ اُس مواد کا اظہار کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے؟ تعبیر یعنی اظہار فنکار نے کیا ہے۔ وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے کیسا ہے؟ جمیل یا غیر جمیل؟ — میرے نزدیک یہ چیز انفرادی ذوق پر منحصر ہے اور ذوق بالعموم اضافی ہوتا ہے کیونکہ ایک ہی شے اپنی مختلف کیفیتوں میں ایک ہی آدمی کے لئے خوبصورتی و بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہے۔ دوسری طرف تمام بلند محسوسات تقریباً

ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان اُن کو ادا کرتے وقت رہ جاتی ہے۔ اسلئے جمیل یا غیر جمیل ہونے سے قبل ایک ادیب کی زبان کو غیر معمولی ہونا چاہیئے!
رہا ذوقِ جمال تو اخلاقیات کی طرح اس میں بھی کم از کم میں تو آج تک کوئی مطلق اور ہمہ گیر اصول تلاش نہیں کر سکا ہر چند کہ سقراط اور افلاطون سے لیکر آج کے ماہر جمالیات کروچے تک اکثر حکماء جمال مطلق کو غیر مطلق صداقت یا حق کہہ کر بزعم خود اس الجھن کا حل پیش کرتے رہے کیونکہ جہاں تک کثرت کے اندر وحدت۔ ہر چیز کا اپنے ٹھکانے پر ہونے اور اپنا مخصوص وظیفہ ادا کرنے اور اس وحدت سے ہم آہنگی اور ارتباط پیدا ہونے کا تعلق ہے، جمالیات اور اخلاقیات میں حیرت انگیز مشابہت ہے اور جس طرح یہ تمام اقدار مشترک شعر و نغمہ میں موجود ہوتی ہیں۔ اُسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر شاید یونان میں پوری قوم کے نفوس میں یہ احساس موجود تھا کہ حق، حسن اور خیر ایک ہی حقیقت کے تین پہلو ہیں اور ہر ایک سے ہر باقی دو پر روشنی پڑتی ہے جیسی کہ انیسویں صدی میں Keats نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا کہ جمال صداقت ہے۔ اور صداقت جمال (Truth is beauty, beauty is truth) اور موجودہ دور میں اقبال نے بھی اسی نظریئے سے متاثر ہو کر کسی جگہ کہا ہے کہ۔ ع

"حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن"

لیکن حسن۔ حق۔ صداقت اور خیر کی اس مبہم تکرار کے باوجود میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ ان غیر واضح الفاظ سے جمالیات کے معاییر پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ فرض کیا جمال صداقت ہے اور صداقت جمال لیکن اس نظریئے پر ایمان رکھنے کے باوجود کم از کم میں نہیں کہہ سکتا کہ پچھلی رات کا چاند جمیل ہوتا ہے یا غیر جمیل؟ یعنی میرے نزدیک تو ان تمام تاویلات سے صرف ایک ایسی بات واضح ہوتی ہے۔ جسے میں تو کیا کم و بیش ہر آدمی پہلے ہی سے جانتا ہے یعنی مطلق جمال اور مطلق اخلاق کوئی نہ کوئی چیز ہے ضرور! البتہ جب تک اضافی پسند و ناپسند کے پردے چاک نہ ہوں۔ ہم اُس جمال مطلق کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے اور چونکہ میرے خیال میں تو اضافیت کا یہ پہلو ہمیشہ سے ہی دبیز رہا ہے۔ اس لئے جمالیات، فی الحال انفرادی، اضافی اور ذاتی چیز ہے! چنانچہ — ادب اور آرٹ کے اس نظریئے کے تحت ایک عظیم فنکار از خود ایک بلند نقاد ہوتا ہے۔ جو ایک ہی اجمالی نظر میں اپنی تمام فنی صلاحیتوں کا احاطہ کرنے کے بعد مجموعی طور پر (As a whole) اپنی تخلیقات پر انتقاد کر لیتا ہے۔ در اصل صحیح تنقید بھی وہی ہوتی ہے۔ جو ایک فنکار — بشرطیکہ وہ فنکار ہو خود اپنے آپ پر کرتا ہے چنانچہ

ایک نقاد جب فنی تخلیقات پر عمل جراحی شروع کرتا ہے۔ جسے مفہوم عام میں تنقید و تبصرہ کہا جاتا ہے تو اس کی حیثیت اس نادان بچے کی سی ہوتی ہے جس کا بے شعور خام اور ناتجربہ کار ذہن تجسس حسین ترین کھلونوں کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ اسلئے میری نظر میں تنقید جزئی نہیں۔ بلکہ کلی ہے۔ لہذا ایک اچھا فن کار خود بخود ایک اچھا نقاد ہوگا۔ مگر ایک اچھے نقاد کیلئے ضروری نہیں کہ وہ ایک اچھا فنکار بھی ہو۔ اسلئے تنقید کی حیثیت میری نظر میں تخلیق کی نسبت ثانوی ہے۔

سعید دُرّانی

دو غزلیں

تصورات کے سائے ہیں کائنات مری
فریب خوردۂ شام و سحر حیات مری

نہ مجھ سے کوئی کبھی اتنی بات پوچھ سکا
کہ کس خیال میں کٹتی ہے ساری رات مری

تری نظر میں "مرا دن" بھی ہے شب دیجور
ہے روز مجھ سے جو پوچھو ہر ایک رات مری

مقام میرا بہت پست ہی سہی لیکن
مکین عرش بھی کر بیٹھتے ہیں بات مری

کبھی نہ وقت نے آواز دے کے مجھ سے کہا
کہ زندگانی ترا انتظار کرتی ہے

جو سوچتا ہوں تو کتنی عجیب بات ہے یہ
کہ جستجو سے سکوں بے قرار کرتی ہے

نہ پوچھ قصۂ غم یہ طویل ہے اے دوست
حقیقت اپنی مجھے اشکبار کرتی ہے

یہ بات ٹھیک کہ مجکو کوئی تمنا ہے۔
وہی تمنا مگر شرمسار کرتی ہے۔

سیح اللہ قریشی

عزم

آج پھر چند عزائم کا سہارا لے کر
ایک کھوئی ہوئی منزل کو بڑھا جاتا ہوں
پچھلے لمحات کے دریا کا کنارا لے کر
اپنے اسلاف کی شہرت کی قسم کھاتا ہوں

نیلگوں قوس مسلسل ہے جہاں پر رقصاں
ان دھندلکوں سے بہت دور چلا جاؤں گا
جسکی رفعت سے شجاعت سے تھا عالم لرزاں
پھر اسی عظمتِ رفتہ کو بلا لاؤں گا

کاٹ ڈالوں گا سلاسل کے وسیع حلقوں کو
اپنے ماحول کو ذلت سے دلاؤں گا نجات
پھاڑ ڈالوں گا ضلالت کے شنیع پردوں کو
اور بدل دوں گا میں صحت میں یہ اسقامِ حیات

اپنے سوئے ہوئے افکار کروں گا بیدار
بھول جاؤں گا غم و یاس کے افسانوں کو
کہنے ماحول کی راہوں سے کروں گا بیزار
زلیت کی راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو

آئے دیکھے کوئی آلام کی تصویروں کو
ان کی بدلی ہوئی آواز بدل ڈالوں گا
توڑ ڈالوں گا میں ان آہنی زنجیروں کو
اپنے ماحول کے انداز بدل ڈالوں گا

ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

اُردو تنقید پر اک نظر

(یہ مقالہ بزم اُردو تعلیم الاسلام کالج کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا اسکا ایک حصہ المنار کے مئی جون کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے)

حالی شبلی اور آزاد ——— اور خصوصاً حالی ان رجحانات تنقید کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے اصول کی بحث بھی کی اور ان اصول کی روشنی میں اپنے ادب و شعر کا جائزہ بھی لیا۔ اور اس طرح اُردو تنقید میں اضافے کئے۔ انہوں نے اُردو میں نئی تنقیدی روایات کی بنیاد ڈالی۔ نئے معیار قائم کئے۔ نئے خیالات و نظریات کو پیش کیا۔ ان کے ہاتھوں صحیح معنوں میں اُردو تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اور یہ سب کچھ سرسید کی تحریک کے زیر اثر ہوا

سرسید کے دور کی تنقید نے صرف نئے معیار پیش کئے اور نئی تنقیدی روایات کی داغ بیل ڈالی۔ بلکہ اردو میں تنقید کے لئے ایک فضا قایم کی۔ جس کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ تنقید کا رجحان عام ہونے لگا۔ اخبارات و رسائل میں تنقیدی مضامین لکھے جانے لگے۔ اور بعضوں نے تو تنقیدی کتابیں بھی لکھیں۔ مثلاً خواجہ امداد امام اثر کی کتاب کاشف الحقائق ایک مستقل تنقیدی کتاب ہے۔ رسائل میں حالی اور شبلی کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں نے تنقیدیں لکھیں۔ ان میں وحید الدین اور مہدی افادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تھوڑے سے فرق کیساتھ ان سب کے بنیادی خیالات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے شعوری طور پر اور بعضوں نے غیر شعوری طور پر سرسید کے زمانے کی تنقید کے اثرات کو قبول کیا ہے۔

تحریک سرسید نے اردو ادب کے مطالعے کی ایک فضا پیدا کر دی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ادبی تحقیق کا رواج ہوا تحقیق و تنقید کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسلئے جن لوگوں نے تحقیق کی طرف توجہ کی انہوں نے اردو تنقید میں بھی اضافہ کیا۔ چنانچہ جن محققین نے اس وقت اور اس کے بعد اردو تنقید کی طرف توجہ کی ان میں ڈاکٹر عبدالحق پنڈت کیفی، حامد حسن قادری، عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمود شیرانی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے مغرب کے اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔ لیکن ویسے ان سب کی تنقیدوں پر حالی اور شبلی کی تنقید کے اثرات غالب ہیں۔

مغرب کے اثرات حالی اور شبلی نے کسی گہرائی کے ساتھ قبول نہیں کئے تھے۔ ان پر مشرقی نظریات تنقید کا اثر تھا۔ پھر بھی کہیں کہیں ان کے یہاں مغرب کے اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مغرب کے اثرات اردو تنقید پر زیادہ گہرے ہوتے گئے اور اُردو تنقید میں ایک دور ایسا بھی آیا۔ جب وہ براہ راست مغربی نظریات تنقید کے زیر اثر آ گئی۔

مغربی نظریات تنقید اور انداز تنقید کے اثرات اُردو تنقید میں بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے قریب تو وہ بالکل ہی مغربی رنگ میں رنگین ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں ہر نقاد اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مغربی انداز کی تنقید لکھے۔ ابتدا میں یہ اثرات اخذ و ترجمہ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس تنقید میں کوئی خاص گہرائی نہیں ہے۔ اس دور کے لکھنے والے یا تو مغربی نقادوں کے خیالات کو بغیر اپنی طرف سے کچھ کہے ہوئے اپنی زبان میں پیش کر دیتے ہیں۔ یا پھر ان کی مختلف تخلیقات سے اپنے شاعروں اور نثر پردازوں کا مقابلہ کرتے ہیں ان کی نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں میں ان رجحانات کا پتہ چلتا ہے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، حامد اللہ افسر، ڈاکٹر محی الدین زور، عبدالقادر سروری اور بعض اسی طرح کے دوسرے نقادوں کے یہاں یہ خصوصیات

ملتی ہیں۔

اس قسم کے اثرات اگرچہ اردو تنقید میں کوئی بڑا اضافہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے۔ کہ انہوں نے مغربی خیالات و نظریاتِ تنقید دونوں سے اردو کو روشناس کیا۔ اور مغرب کے اثرات کو گہرائی کے ساتھ قبول کرنے کی ایک فضا پیدا کر دی چنانچہ ایک وقت ایسا آیا۔ جب اس میں غور و فکر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور مغربی نظریات تنقید خود اپنی فکر کا حصہ بنا کر پیش کئے گئے۔ اس طرح صحیح معنوں میں سائنٹیفک تنقید کی ابتدا ہوئی جس کا سلسلہ آج اردو تنقید میں جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا کیونکہ اب اس میں صرف مغربی آقاؤں کی حکمرانی کو دخل نہیں۔ بلکہ ذرائع و رسائل کی برق رفتاری بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ ایک تحریک جو مغرب میں چلتی ہے ناممکن ہے کہ اس کا اثر اس ملک پر نہ پڑے۔

مغرب کے زیر اثر اردو میں جو سائنٹیفک تنقید کی ابتدا ہوئی اس کے علمبرداروں میں رشید صدیقی، نیاز مجنوں، فراق، اختر حسین رائے پوری، سید سجاد ظہیر، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین اور وقار عظیم وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے بنیادی نظریات یہ ہیں کہ ادب نہ صرف زندگی کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا نقاد بھی ہوتا ہے۔ اور اس زندگی کی نوعیت اجتماعی ہوتی ہے۔ اس لئے اجتماعی زندگی کے مدوجزر کے اثرات ادب میں بھی نظر آتے ہیں۔ ادب اجتماعی زندگی سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کو متاثر کرتا بھی ہے۔ اسلئے ادب کے مطالعے کے لئے سماجی زندگی کی ساری الجھنوں اور پیچیدگیوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان میں سے بعض نقاد زندگی کو اشتراکی اور مارکسی نظریات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اور اسی فلسفے کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور یہ رجحان آج اردو تنقید پر غالب ہے۔ جو نقاد ترقی پسند تحریک میں شامل ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں اس رجحان کے اثرات ملتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم، سید سجاد ظہیر، سید احتشام حسین مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ممتاز حسین وغیرہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ باقی نقادوں کے یہاں اعتدال اور توازن ہے وہ پوری طرح اس رجحان کے علمبردار نہیں ہیں۔ بہرحال اردو تنقید میں حقیقت نگاری کا رجحان انہیں کے ہاتھوں آیا ہے۔ البتہ اس حقیقت نگاری کی نوعیتیں مختلف نقادوں کے یہاں مختلف ہیں۔

اردو تنقید پر آج یہ رجحان چھایا ہوا ضرور ہے۔ لیکن بعض نقاد ایسے بھی موجود ہیں۔ جو ادب کو محض ابدی مسرت کا ذریعہ اور روحانی تسکین کا وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ ہرچند کہ زندگی کی ترجمانی پر یہ بھی زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نظریاتِ تنقید میں عینیتی فلسفے کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایسے نقادوں میں جعفر علی خاں اثر، صلاح الدین احمد، اختر علی ، محمد حسن عسکری، اور اسی طرح کے بعض اور نقاد شامل ہیں عینیت پسندی اور حقیقت نگاری کے متضاد رجحانات میں آج ایک کشمکش بھی جاری ہے۔ کیونکہ یہ کشمکش آج خود ہماری زندگی میں موجود ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ ادب برائے ادب کا نظریہ اب اردو میں پنپتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔

زندگی آج تیزی سے انقلاب کے سانچے میں ڈھل رہی ہے حالات میں ہر روز نت نئی اور رنگا رنگ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مختلف علوم نئی راہوں پر گامزن ہیں۔ اردو تنقید ان سب سے متاثر ہو رہی ہے۔ اور ان سب کے نتیجہ میں۔ جو نئے رجحانات زندگی میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کا اثر اردو تنقید پر بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ جدید اردو تنقید آج رنگا رنگ رجحانات کا گلدستہ ہے۔ اور یہ رجحانات مطالعے کا الگ موضوع ہیں۔

ان باتوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو تنقید ایک مستقل حیثیت رکھتی ہو۔ اس کا مسلسل ارتقا بھی ملتا ہے۔ اس کا وجود محض فرضی نہیں ہے۔ وہ نہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے نہ معشوق کی موہوم کمر!

تین شعر

پھر لرزہ دیا زدہ ہے ہنگامۂ تازہ ہے
کیوں جوشِ خروشی کی ہر بانگ خردشی سے!

برباد بھی یہ دُنیا! آباد بھی یہ دُنیا
تخریب شاطیں سے! تعمیر سردشی سے!

تعریف کے پُل ڈھاجا، توصیف سے باز آجا
بیزار ہوں از بس میں اس یار فروشی سے!

محمود ایاز

قاصد ظریف

ساقی

(جگر مراد آبادی سے معذرت کے ساتھ)

نیا موسم، نئے میکش، نئی ہے انجمن ساقی
بدل دے از سرِ نو تو بھی اندازِ کہن ساقی

بدلتے جا رہے ہیں میکشوں کے سب چلن ساقی
نہ ہے وہ گفتگو ان کی نہ وہ طرزِ سخن ساقی

کبھی تو نے بھی دیکھا ہے مرا دیوانہ پن ساقی
شکستِ ساغر و مینا پہ دل ہے خندہ زن ساقی

نئی منزل، نئی راہوں پہ ہم ہیں گامزن ساقی
نئی دل میں اُمنگیں ہیں نئی دل میں لگن ساقی

چھپے ہیں راستے میں گو ہزاروں راہزن ساقی
چلا میں سوئے منزل باندھ کر سر پہ کفن ساقی

سُنا ہے حضرتِ واعظ بھی تیرے در پہ آتے ہیں
تجھے شاید نہیں معلوم ان کے مکر و فن ساقی

دبی چنگاریاں آہوں کی اپنے اپنے سینوں میں
لئے بیٹھے ہیں جانے کب سے یارانِ وطن ساقی

لبِ نازک پہ آ کے رُک گئے شکوے عنادل کے
بڑے عیار ہوتے ہیں یہ اربابِ چمن ساقی

دیارِ غیر سے لائی ہوئی صہبا سے کیا ہوگا
حجازی مے بجھا سکتی ہے اس دل کی جلن ساقی

پروفیسر بشارت الرحمان ایم۔ اے

تاریخ اسلام کے متعلق بعض اصولی نظریے

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے متعلق جب ہم مستشرقین کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی تاریخ کے متعلق وہ بعض ایسی باتیں کہہ گئے ہیں۔ جو بعض قرآنی نظریات سے ٹکراتی ہیں۔ مستشرقین نے یہ امور یا تو تعصب کی وجہ سے اپنی کتب میں لکھ دیئے ہیں۔ یا اسلامی تاریخ سے مکمل واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان پر چنداں افسوس بھی نہیں کہ کیوں انہوں نے اپنی تاریخی موشگافیوں کو قرآنی نظریات کے پس منظر میں نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہ تھے۔ اور نہ ہی وہ قرآن کریم کو کلام اللہ سمجھتے تھے۔ لیکن افسوس ان مسلمان مؤرخین پر ہے۔ جو ان مستشرقین کی نقل میں بلا تحقیق وہی باتیں اپنی تاریخی کتب میں دہراتے ہیں۔ خواہ وہ قرآنی نظریات سے کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔ پھر وہ یہ بھی عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ کہ قرآن کلام اللہ ہے۔

خلافت راشدہ کی تاریخ میں ہم اکثر مؤرخین کی اس قسم کی افسوسناک غلطیوں سے دو چار ہوتے ہیں۔ ان کی تاریخی کاوشوں اور موشگافیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مؤرخین کو خلافت راشدہ کے متعلق صحیح قرآنی نظریئے سے واقفیت نہیں۔ نہ ہی انہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی حقیقی شان کا کما حقہٗ احساس ہے۔ انہیں اس امر سے واقفیت بھی نہیں کہ قرآن کریم نے صحابہ کرام کے متعلق کیا نظریات قائم کئے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض قیاسات کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت پر بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اور ان خلفاء کو مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری ایام کے فسادات کی وجہ آپ کی ذاتی کمزوری اور اقربا نوازی تھی۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر اکابر صحابہؓ کو بھی مطعون کیا جاتا ہے۔ اگر یہ مؤرخ قرآنی اصولوں کو اپنی تاریخی کاوشوں کی بنیاد بناتے تو اللہ تعالیٰ یقیناً ان کے ذہنوں کو اصل حقائق کی طرف پھیر دیتا لیکن ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

اس مختصر مضمون میں میں قرآن کریم کے ان اصولوں میں سے بعض کا تذکرہ کروں گا جو ابتدائی اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تھوہر کے پودے کو کبھی انگور نہیں لگتے۔ نہ ہی کبھی آم کے درخت کو سنگترے لگتے ہیں ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ اسلام اور امت مسلمہ وہ نورانی درخت ہے جس کا بیج حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے سب سے پہلے سرزمین عرب میں بویا گیا۔ انہی مقدس ہاتھوں نے اس پودے کی آبیاری کی اور اپنے اوپر تمام جسمانی آرام اور راحتیں حرام کر کے اس مقدس پودے کی نگہداشت کی۔ مخالفین نے چاہا کہ اس پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اپنے رسول کو مخاطب کر کے فرمایا۔

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (التوبۃ رکوع ۵)

یعنی کفار چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اس بات پر مُصر ہے کہ اپنے نور کو مکمل کرے خواہ کفار اس امر کو ناپسند ہی کریں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا نورانی پودا دیکھتے ہی دیکھتے بڑھا اور اپنی جڑوں پر قائم ہو گیا اور پھر ایک تن آور درخت کی صورت اختیار کر گیا۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ و دیگر اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اس پودے کے ان اولین پھلوں میں سے تھے۔ جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کر لیے۔ اگر اسلام کے ان پھلوں میں وہ نقائص تسلیم کر لئے جائیں تو لازماً اُس درخت میں بھی وہ نقائص تسلیم کرنے پڑیں گے جس سے اسلام کی صداقت مشتبہ ہو جائیگی۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں جو اسلام کو ایک نورانی پودے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ خود قرآن کریم سے یہ تشبیہ اخذ کی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراہیم رکوع ۴)

یعنی (اے مخاطب) کیا تُو نے دیکھا نہیں (کہ) اللہ تعالیٰ نے کس طرح ایک پاک کلام کی حالت کو کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ پاک کلام جو ایک پاک درخت کی طرح ہے (اور) جسکی جڑ مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور اس کی (ہر ایک) شاخ آسمان (کی بلندی) تک (پہنچی ہوئی) ہے۔ وہ درخت ہر وقت اپنے رب کے اذن سے اپنا (تازہ) پھل دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے ان کی ضرورت کی تمام باتیں بیان کرتا ہے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا کہ پھل دیتا ہو بلکہ اُكُلَهَا فرمایا ہے یعنی درخت کی طرف ضمیر پھیر کر اس کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا کہ وہ پھل اپنے اندر درخت والی خوبیاں رکھتے ہوں۔ جو خواص اس درخت میں ہوں وہی ان پھلوں میں ہوں۔ یعنی قرآن پر عمل کرنے والے لوگ اس کے ذریعہ سے ایسے اعلیٰ مقامات تک پہنچ جاتے ہیں کہ انکی زندگی کا ہر لمحہ قرآن کریم کی تعلیم کی عملی تفسیر ہوتا ہے۔

لیئے اب ہم دیکھیں کہ خلفاء راشدین کے متعلق قرآن کریم کیا ارشاد فرماتا ہے۔ خلافت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور رکوع ۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے (اے مسلمانو) تم میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اور مناسب حال اعمال کیئے۔ وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور بالضرور انہیں زمین میں خلیفہ بنائیگا جیسے کہ اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) اُن سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا۔ خدا تعالیٰ ان خلفاء کے دین کو جسے اُس نے انکے لئے پسند کیا تمکنت اور مضبوطی بخشیگا۔ اور ضرور بالضرور انکے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ یہ خلفاء میری ہی عبادت کرنے والے ہونگے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو لوگ انکے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد ان کی خلافت کا انکار کریں گے وہ فاسق ہونگے۔

آیت مندرجہ بالا کی (جو آیت استخلاف کہلاتی ہے) مزید تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ خلفاء راشدین کے عظیم الشان مرتبہ کو اس آیت کریمہ میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ گو ان خلفاء کے تقرر میں بظاہر انسانی ہاتھ کارفرما نظر آئے گا۔ مگر درحقیقت یہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ ہونگے۔ اسلام کی کشتی کے ناخدا اپنے اپنے زمانہ میں یہی لوگ ہونگے۔ جنکا تقرر ان کی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوگا۔ اب دیکھئے کہ اگر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا تقرر بطور خلیفہ اس آیت کے منشاء کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مانا جائے۔ تو کیا اُن اعتراضات کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔ جو ان بزرگوں پر کئے جاتے ہیں؟ مثلاً یہ کہ انہوں نے عمال کا تقرر اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی رشتہ داری کی بناء پر بد دیانتی سے کیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے فلاں اپنی خلافت میں ناکام رہا۔؟ کیا خدا تعالیٰ کے تقرر میں نقص پیدا ہو سکتا ہے۔؟ اگر ان خلفاء میں وہ نقص تسلیم کر لئے جائیں تو کیا اللہ تعالیٰ کی غیب دانی پر حرف نہیں آتا؟ میری اس تحریر سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے۔ کہ خالص تاریخی نقطۂ نگاہ سے اُن اعتراضات کو رد نہیں کیا جا سکتا اس مضمون میں میں صرف قرآنی نظریات کا ہی اختصار سے ذکر کرونگا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو خلفاء کا وجود انبیاء کے وجود کی ہی توسیع کا نام ہے۔ ان خلفاء کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نبی کے نور کو ایک لمبے عرصہ تک ممتد کر دیتا ہے۔ خلفاء انبیاء کے روحانی جانشین ہوتے ہیں۔ اگر انبیاء کو عصمت کبریٰ حاصل ہوتی ہے

تو خلفاء کو عصمت صغریٰ اللہ تعالیٰ اپنے اُس نور کی مثال جو اللہ تعالیٰ نبی کے ذریعہ دنیا میں نازل کرتا ہے۔ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ وہ نور ایک چراغ کی طرح ہے۔ جس کے سامنے ایک آئینہ ہے۔ آئینہ سے مراد نبی کا وجود ہے جس میں سے گذر کر خدا تعالیٰ کا نور دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن یہ نور ایک طاقچے میں ہوتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے بیٹری کا بلب REFLECTOR میں ہوتا ہے۔

REFLECTOR کی اپنی ذاتی روشنی نہیں ہوتی وہ صرف اُس نور کو منعکس کر کے دور تک لیجاتا ہے۔ خلفاء کا یہی کام ہے۔ جو REFLECTORS کا ہے۔ وہ اپنے نبی کے REFLECTOR ہوتے ہیں۔ اور اس کے نور کو دور تک ممتد کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ آیت کریمہ جس میں مندرجہ بالا تشبیہ کا ذکر ہے۔ مندرجہ ذیل ہے۔ اور اُسی سورۃ میں ہے جس میں کہ آیت استخلاف ہے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۔ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۔ (النور رکوع ۱۵)

یعنی اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (اس نور کے مخصوص طور پر ظاہر ہونے کی) مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ روشن ہو۔ اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو۔ اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۔

(النور رکوع ۵)

یعنی (۱) ۔ یہ نور روشن ہے کچھ گھروں میں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ معزز کئے جائیں اور ان گھروں میں اس کے نام کا ذکر ہوتا رہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلعم کے گھر کے علاوہ کچھ اور گھر بھی ہیں۔ جو الٰہی نور کے حامل ہونے والے ہیں۔ اور انہیں خلعت سے سرفراز کیا جائے گا۔

(ب) ۔ ان گھروں میں تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔ صبح اور شام ایسے مرد کہ انہیں ذکر الٰہی۔ باجماعت نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے نہ کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و فروخت غافل کر سکتی ہے۔ ان الفاظ میں صریح طور پر خلفاء اور ان کی بلند شان کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ج) ۔ وہ مرد ڈرتے ہیں اُس وقت سے کہ جس میں دل اور آنکھیں مضطرب اور بے چین ہو جائیں گے۔ اس سے صاف اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان خلفاء پر بعض اس قسم کے الزام لگائے جائیں گے۔ جن کی وجہ سے ان کی کامل دیانتداری اور تقویٰ مشکوک نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ الزام غلط ہونگے کیونکہ یہ لوگ کامل طور پر متقی اور خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے ڈرنے والے ہونگے۔

خلفاء کے علاوہ عام صحابہ رضوان اللہ علیہم بھی عظیم الشان روحانی مقام رکھنے والے لوگ تھے یہ ان لوگوں کی طرف عیوب منسوب کرنا گویا اسلام کے خوشنما چہرہ پر داغ لگانے والی بات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں،

اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ ۔

یعنی میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ آنے والے تاریک حالات میں ان میں سے جس کی بھی تم اقتداء کرو گے تم فلاح اور کامیابی حاصل کر لو گے۔ اور قرآن کریم نے صحابہ کو "بہترین مخلوق" قرار دیا اور انہیں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا چنانچہ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (البینۃ ع ۱)

صحابہ کی عظیم شان کا اظہار قرآن کریم کی کئی اور آیات سے بھی ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک آیت یہاں پر اور نقل کر دی گئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (توبہ ع ۳)

یعنی وہ لوگ جو محمد رسول اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور بہت ہی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونیوالے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے مؤرخین کو اسلام کے ابتدائی ایام کی تاریخ لکھتے ہوئے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کی اُس بزرگی اور عظمت کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے جسکا اظہار کلام اللہ میں ہوا ہے اور جس پر صحابہ کی جانی اور مالی قربانیوں نے عملی طور پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ انسانی روایات میں غلطی کا امکان ہے مگر خدا تعالیٰ کے کلام میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اگر ہمارے مؤرخین قرآن کریم کے مندرجہ بالا نظریات کو اپنی تاریخی کاوشوں کی بنیاد بنائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور اصل

جنید ہاشمی بی۔ اے

مکتوباتِ نبوی صلعم پر ایک نظر

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں اور قبیلوں کے سرداروں کے نام جو تبلیغی خطوط روانہ فرمائے تھے۔ ان کی تعداد جدید ترین تحقیقات کی رُو سے کوئی دو سو سے لیکر اڑھائی سو تک کہی جاتی ہے۔ اگرچہ ان سب کو کسی ایک مجموعہ میں یکجا نہیں کیا گیا تاہم اکثر خطوط کے متن اور چربے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے حضرت عمرو بن حزم۔ گورنر یمن نے کوئی بیس کے قریب مکتوباتِ عالیہ اکٹھے کرنے کی سعادت حاصل کی۔ کچھ خطوط کے اصل زمانہ کی دستبرد سے تلف بھی ہو چکے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بعض مکتوبات حجاج بن یوسف کے عہد میں یوم الجماجم کے موقع پر سرکاری ریکارڈ آفس میں جل کر ضائع ہو گئے ہیں۔ اور بعض خطوط خود مکتوب الیہم کی عدم توجہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ میں متعدد خطوط کے اصل کی موجودگی کا ذکر سننے میں آتا رہتا ہے۔ ان خطوط میں سے بعض اصلی رنگ میں اور بعض کے عکس۔ چربے اور فوٹو یورپ کی مشہور لائبریریوں کی زینت ہیں۔ اور ایک دو خطوط ایسے ہیں جو بعض گرجاؤں اور پادریوں کے پاس ذاتی حیثیت سے موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ دعویٰ سے نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یہی وہ اصل خط ہے۔ جس کا قرطاس، سیاہی، اور مُہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کے سامنے استعمال کی گئی۔ پھر بھی ایک دو مشہور عام خطوط کے بارے میں جو تحقیق و تصدیق ہوئی ہے۔ اس کا حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا خط وہ ہے جو ہجرت کے بعد ۶ھ میں (یعنی صلح حدیبیہ کے وقت) لکھا گیا۔ عرب کے ہمسایہ میں ایران اور روم دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ جن میں بحرین۔ عمان۔ اور یمن تک کے علاقے شامل تھے۔ بلکہ مصر و حبشہ پر بھی ان کا اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا ایک ذریعہ یہ بھی سوچا کہ حکومتوں کے بادشاہوں کو خطوط روانہ کیے جائیں۔ چنانچہ آپؐ نے سفیروں کو نامزد کرنے سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے معجزے اور فرستادہ حواریوں کا قصہ بیان فرمایا کہ کس طرح حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی اور ہر ایک حواری اس ملک کی زبان بولنے لگ گیا جہاں وہ بھیجا جا رہا تھا۔ اور فرمایا کہ تم لوگوں کو ان حواریوں کی طرح ہچکچاہٹ اور پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد اعلان فرمایا کہ فلاں شخص فلاں حکمران کے پاس خط لے جائے اور فلاں شخص فلاں کے پاس ـــــ اسکے بعد آپ نے قیصر روم ہرقل کے نام ایک خط روانہ کیا۔ دوسرا خسرو پرویز دافعی ایران کے نام لکھا۔ اس کے علاوہ بحرین کے صوبہ دار منذر بن ساوی کے نام بھی ایک مکتوب دیا۔ اور مصر کے صوبہ دار پادری مقوقس کو بھی خط بھیجا۔ آخر الذکر دو خطوط کے اصل حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے مقوقس پادری کے نام کے خط کے بارے میں مشہور فرانسیسی مستشرق رے نو (REINAUD) نے ۱۸۵۵ء میں تنقید کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"موسیو بار تھلمی قاہرہ کے بڑے ماہر عربی ہیں۔ خاص کر قبطی زبان کے مخطوطات تلاش کر رہے ہیں۔ جو مصر کے تنہا پسند راہبوں کے پاس ہیں ..... وہ اخمیم کے قریب ایک راہب خانے میں پہنچے۔ اس راہب خانہ میں ایک عربی مخطوطہ دستیاب ہوا ..... اس کی جلد کناروں سے خراب ہو گئی تھی اس کے اندر سے کچھ قبطی حروف دکھائی دے رہے تھے ہمارے سیاح نے کوشش کی کہ اس پہلے ورق کو الگ کرے جو متعدد لکھے ہوئے اوراق سے لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ جب احتیاط سے اسے علیحدہ کیا گیا۔ تو وہ دراصل دس اوراق تھے۔ جن پر قدیم قبطی خط میں انجیل لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ

موسیو بارتھلمی نے دونوں پہلوؤں سے ان قبطی اوراق کو یکے بعد دیگرے جدا کیا۔ جو کتاب کی جلد کے داخلی حصہ پر مشتمل تھے۔ ان پر انہیں ان اوراق کے انہی بیچ میں دونوں پہلوؤں سے چپٹا ہوا کھال یا جھلی (PARACHEMINI) کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ جسے کیڑوں نے دو جگہ سے چاٹ لیا تھا۔ موسیو بارتھلمی کو اس پر کوفی خط میں کچھ عربی حروف سے نظر آئے۔ ہزار کوشش کے بعد انہوں نے تحریر کو پڑھ لینے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد متعدد لوگوں کی مدد سے اس تحریر کو پڑھنے اور عربی تاریخی کتب سے اس کے متن کی تصدیق کر لینے کا ذکر ہے۔ وہ خط یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فعلیک اثم القبط یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

مندرجہ بالا خط کے فوٹو میں مہر کا نشان بھی موجود ہے۔ جو اگر یہ نقل ہوتی تو نہ آ سکتی۔ یہ خط عبد الحمید اول کے پاس تین سو اشرفیوں کے عوض بیچا گیا۔ اور قصر شاہی کے خزانے میں داخل کیا گیا۔ غالباً اس کی نقلوں کے فوٹو رسالہ الھلال قاہرہ اور اسلامک ریویو ووکنگ میں بھی چھپے تھے۔ لیکن وہ اصل خط کے فوٹو نہیں بلکہ ٹریس شدہ کاپی یا چربہ کے فوٹو تھے۔ اصل خط اب تقریباً لاپتہ ہو چکا ہے۔ لہذا اس کے اصل ہونے کے خلاف مندرجہ ذیل اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

(۱) اس خط کی تحریر اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ بعد کی ہے۔

(۲) مقوقس کا نام بعد کے اسلامی مورخ کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ عہد نبوی کے مقوقس کا نام حقیقت میں "بن یامین" تھا۔

(۳) خط میں درج ہے۔ کہ ہم ایک ہی خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔" حالانکہ عیسائی تو تین خداؤں کو مانتے ہیں۔

مندرجہ بالا اعتراضات زیادہ تر خارجی اور قیاسی ہیں۔ خود خط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خط عہد نبوی کے رواج کے مطابق کھال پر ہے۔ کاغذ پر نہیں۔ پھر بھی عام روایت کے مطابق تین سطریں ہے۔ یعنی نیچے محمد پھر رسول اور اوپر اللہ۔

جرمنی کے ایک اور یہودی النسل مستشرق نولڈکے (NOLDERE) نے یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ اس طرح اس زمانے میں لوگ دستخط کے لئے سیاہی سے مہر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ طین خاتم (TONSIE GEL) ایک طرح کی چکنی چپٹنے والی مٹی) پر مہر دباتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک طین خاتم کا ذکر عربی ادبیات میں قدیم سے ملتا ہے لیکن یہ طین خاتم خط کے اوپر لپیٹے ہوئے کاغذ (لفافہ) پر لگائی جاتی تھی جیسا کہ آجکل یہ کام لاکھ سے لیا جاتا ہے۔ تاکہ لفافہ سوائے مکتوب الیہ کے کوئی نہ کھولے۔ پس اس مکتوب پر جس مہر کا ذکر ہے۔ وہ چاندی کی اس مہر کا نشان ہے۔ جس پر محمد۔ رسول۔ اللہ۔ کے نشان کندہ تھے۔ جس کا عکس فوٹو میں موجود ہے۔

دوسرا خط:۔ جو مقوقس کے نام کے خط کے چند ماہ بعد بحرین کے گورنر منذر بن ساویٰ کے نام لکھا گیا۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول اللہ الی منذر بن ساوی سلام علیک فانی احمد اللہ الیک الذی لا الہ الا ھو واشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ اما بعد فانی اذکرک اللہ عز وجل فانہ من ینصح فانما ینصح لنفسہ وانہ من یطع رسلی ویتبع امرھم فقد اطاعنی ———— الجزیہ۔

اس خط کا متن کئی ایک مستند عربی کتب میں موجود ہے اور اصل خط جرمنی کی کسی لائبریری میں موجود بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل کی دریافت کی کہانی کو ڈاکٹر بوش جرمن سفیر قسطنطنیہ نے ۱۸۶۳ء میں یوں بیان کیا ہے:۔

گذشتہ موسم خزاں میں میری ملاقات ایک اطالوی شخص سے ہوئی۔ جس کے پاس (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک مکتوب تھا۔ اس لئے یہ خط اور چند سورے گذشتہ موسم گرما میں دمشق میں مسلمانوں کے بھیس میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہوئے خریدے۔ یہ خط نیز قرآن کے مذکورہ سورے ایک نہایت مہین اور سیاہی مائل بھوری (DUNKELBRAM) جھلی کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے تھے۔

اس خط پر رسالہ کے ایڈیٹر فلائشر نے فٹ نوٹ دیا ہے۔ جس میں اس کے اصلی ہونے پر متعدد اعتراض کئے ہیں۔

(۱) اس خط کا متن کہیں بھی نہیں ملتا ۔ اس لئے ایجاد ہے (۲) لفظ "المنذر" کو "المنزر" "غیرہ" کو "غیبرہ" اور "اشہد" کو "اشعد" لکھا ہے ۔ (۳) پیش نظر فوٹو میں مرسل اور مرسل الیہ کا نام تو صاف ملتا ہے ۔ لیکن جعلساز نے اس کے بعد عربی نما شکلیں بنا دی ہیں ۔ وہ کوئی عبارت نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا اعتراض وزنی نہیں ہیں ۔ کیونکہ (۱) عربی ماخذ اور تاریخی کتب میں اس خط کا متن موجود ہے ۔ البتہ کہیں کہیں بعض الفاظ میں تغیر و تبدل ضرور ہے ۔ (۲) تیرہ سو سال پرانے زمانہ کا لکھا ہوا خط ہے اگر کہیں کہیں سیاہی اڑ گئی ہے یا دھبے پھیل گئے ہیں تو کوئی اعتراض کی بات نہیں ۔ (۳) عہد نبوی میں حروف پر نقطے یا اعراب نہیں تھے ۔ اسلئے غیرہ کا غیبرہ نظر آنا امتداد زمانہ کا اثر ہے ۔ اشہد کا اشعد نظر آنا محض ستم ظریفی ہے ۔ اس زمانہ میں ھ کو ع لکھا جاتا تھا ۔ فلاتشرز کے علاوہ کسی اور نے اس خط پر کچھ نہیں لکھا ۔ لہٰذا اس کے اصلی ہونے میں زیادہ شک کی گنجائش نہیں ۔

تیسرا خط ابھی چند سال ہوئے اخباروں میں موجودہ نجاشیٔ حبشہ کے پاس ہونا بیان کیا گیا ہے ۔ یہ مکتوب نجاشی اصحمہ کے نام لکھا گیا تھا ۔ اگرچہ اس کے متعدد عکس اور فوٹو شائع ہوئے ۔ لیکن کسی مستند شخص نے اپنی آنکھوں سے اسے نہیں دیکھا ۔ اور نہ اس کی تصدیق کی ہے ۔ اس لئے اسکے اصل یا نقل ہونے کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا ۔

قطعہ

اٹھ! کہ نظام کائنات مائل ابتری ہے پھر
وقت ہے تیرے ہاتھ میں وقت کا انتظار کیا
کارِ عظیم چاہیئے طبع سلیم چاہیئے
عزمِ صمیم چاہیئے ۔ فکرِ مآلِ کار کیا

جگر مراد آبادی

محمود ایاز

بندگانِ خدا

وجودِ کُن کا رہین و ممنون
نظامِ شام و سحر کا افسوں
جہانِ قیصر، عنانِ کسریٰ
غضب کی چشمک تو پھر دگرگوں
خدا کے بندوں کی شانِ فرماں
سُقوطِ سیلابِ نیل و جیحوں
جنہوں نے اپنا لیا خدا کو
زمیں انہی کی انہی کا گردوں
جُنوں پہ وارفتہ جنکی اُلفت
انہیں کا ہے عشق رشکِ مجنوں
ثباتِ وجاوید اُن کا ورثہ
جگر نے جن کے بہا دیا خُوں!
نہیں جو نکتہ شناس فطرت
سمجھ سے بالا یہ سارے مضموں

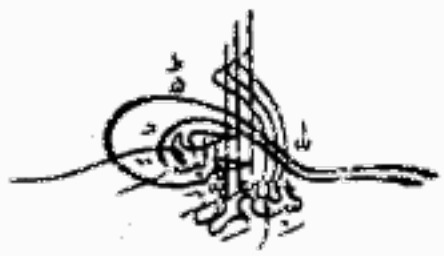

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

NOVEMBER--DECEMBER 1952

★

Staff Editor

Prof. Akh. M. Abdul Qadir, M. A.

Student Editors

Nur-ud-Din Ahmad

Hamid Ahmad

★

CONTENTS

Vol. 3. No. 2

1.	Editorial—Flowers and Fireworks	M. A. Q.	2
2.	The Greedy Jagirdar	A. Hessen	13
3.	Re-appear	N. D. Ahmad	15
4.	How to read	Hamid Ahmad	18

Editorial

FLOWERS AND FIREWORKS

Part I - Flowers **(Continued from previous issue)**

STREWING the paths of triumphant processions formed to welcome back home the victor-hero with flowers of every sort is an ancient custom and tradition. The cheering crowds along the route shower petals and blooms as the "cynosure of all eyes" comes in sight in the slow moving pageant. At royal banquets in [illegible] the like of which so far Babylonia, [illegible] have never been heard of, roses, jasmines and their petals used to be rained down from the balconies and galleries above, on the king, his courtiers and satraps, while the heaped up dainties glutted their ravenous maw and the golden cups replete with sparkling wine went round at the sumptuous board. These again invade even the market place ; fruits are tastefully decorated with petals and grow tempting. Rose-leaves, for instance, strewn over portions of sugar cane, mulberries, straw-berries, raspberries ; black, yellow cherries, etc. are a stock example.

Art is nothing but imitation of nature's works with versimilitude carried to a high pitch, and man's skill and ingenuity set to work early in history and manifested themselves in almost finished products in this line. The Romans achieved their imitation of flowers in gold and silver. The Egyptians made a marvellous use of painted linen and shavings [illegible] of horn, while the Chinese stand unsurpassed in the art with the help of rice-paper. The Italians exhibited their genius by means of silkworm cocoons from which they fashioned all specimens. People in South America use plumage and feathers of highly coloured birds and produce gaudy effects; other materials like wax, small tinted shells, paper, etc. are abundantly utilised to promote this trade. In our opinion coloured rice-paper serves this purpose best on the economical as well as on the aesthetic basis. A basket full of such flowers at a distance captures your fancy as the genuine

ones; it is at very close quarters that you get disillusioned. They figure capitally in showcases, a blaze within a blaze, and are responsible for the artistic charm of window dressing. They constitute a powerful aid to celluloid illusion in film studios when floral settings are needed and thus save a lot of expenditure. Domestic felicity also shares the blessings of this product of the human art. Most of the middle and poor class people have a recourse to them as decorative material as they are cheaper and last longer than their prototypes, thereby appeasing juvenile importunity and gratifying elderly vanity.

No school of heraldry is complete without floral beauties. They are represented in heraldic coats-of-arms all over the world. The escutcheons of queens and kings, the shields of knights and peers bear them in a thousand and one patterns. The three lilies (fleur-de-louis) embroidered on the silken banners of the sovereigns of France, the white and the red roses of the Houses of York and Lancaster in English history, between which a civil war broke out known as the War of Roses, as rival claimants to the throne, are cited just as a couple of instances. Heraldry is a science in itself which will require even in this respect an omnibus volume to trace the origin, growth and deve lopment of heraldic designs and myriads of orders of knighthood, peerage and companionage, both medieval and modern. It will be not a matter of surprise if this science is also subjected to the streamlining process like steam, petrol, electricity, architecture, music, dancing, beauty. In a way it may be a vague foreshadowing of the shape of things to be.

Treatment of flowers by poets is again an extremely interesting subject marked conspicuously with singular characteristics of each. In Shelley they are etherial as everything else; Keats paints them with a painter's objective touch; Tennyson's description of them is both scientifically accurate and exquisite: Arnold's is of scholastic purity and grace; while Wordsworth inevests them with feelings and emotions and considers them to be a source of spiritual rapture or serene joy. The dancing daffodils

"flash upon that inward eye,
Which is the bliss of solitude."

To him" the meanest flower that blows gives thoughts that do often lie too deep for tears". Iqbal also in his oriental way imparts to them the sentimental touch and uses 'Lala' (the poppy with the blighted heart) and 'gul' (the rose with the bleeding bosom) as symbols as most of the creative geniuses do. The rose is symbolic of love and beauty, the lily of grace and purity, the violet

of chastity and modesty, the tulip of elegant majesty, the lotus of queenly grace and charm, the daffodil and marigold of joy and mirth, the pansy of pensiveness, etc.—which all has made both human thought and language so chaste and beautiful.

Last but not the least comes the geographical reference, by way of completing this desultory survey, to those regions where Nature, through her special dispensation, has been exceedingly liberal and generous in floral bounties. Across the Atlantic, in North America, Alaska; California and Lincolon-lands in U. S. A.; central Mexico; in Europe, England, particulaly the Lake District, certain parts of Norway and Sweden, the southern smiling shores of France, Italy, Georgia and the valleys of Caucasus; central and western parts of Iran the rose and the nightingale of which have been embalmed in the immortal verse of many a poet; Kaghan Valley and Kashmir of the Indo-Pakistan sub-continent and Japan "the land of the chrysanthemum", in the far east, are some of the countries which may truly be called the home of sweet flowers.

Part II-And Fireworks

Nature's bounties have their measures and methods. Man in his bloated vanity, often claims to go by analogy in his works which instead of being conducive to collective security and happiness lead to disaster and devastation. This is all because the motivating force, which is intensely vivid in its egotistic vision, is blind in respect of wider issues, and the outward actions in which it manifests itself pass muster with the ignorant millions under the label 'humanitarian'. But the bright sheen of vinegar cannot for long coax us into taking it for the sparkling wine. The bitter taste and sickening effect will reveal the stuff and then there will be no mistaking. Moral principles cannot be trampled under foot with impunity. Spiritual values cannot be thrown to the winds without paying the penalty. "Might is right", in its material and physical sense, when it attains to its climax, cannot but spell ruin to the world as it comes into direct conflict with Nature's order. Nettles will never yield corn, nor will the thistles grow into eared-wheat. This was ever so. But man in what he has made of man seems still to hug the delusion that good acts can spring from ill intents, that mistrust and fear beget trust and hope. To say that our high-flown rhetoric, our twists and turns of sophistry, our subtleties of diplomatic controversies can gloze over the bare truth, can impart a gloss to grim facts and stark realities, in short, can cast a veil over our misdeeds is like living in a fool's paradise. Such a mode of thinking can hardly afford foundation on which to build the

future of mankind. But all this prattle about the world peace and practice of war may be traced to what we may call the mental make-up of a martial type. It has its deep springs in the bellicose temperament whose workings have evolved a peculiar war philosophy. The entire outlook on life has undergone a reorientation and has become the bane of humanity. Life on the whole is a struggle, which truth none can deny, but that wars should be interpretted in the blood-red light and construed into a wonted vocation is overleaping the bounds of reason. Nature in a way is represented by the war-mongers as being "red in tooth and claw", which furnishes both a specious justification for man's besmearing his hands with the blood of brother man and a fresh proof in support of the survival of the fittest. The interim of peace is a 'blessing', inasmuch as it offers a breathing space and another opportunity to make preparations for war, which, to their mind, of course, is the normal business of life. Thus the demon of war stalks the world, disguised as the apostle of peace. The olive branch in reality is the red-rag to the ferocious bull, the little tender dove hides beneath its soft plumage the talons of an eagle.

The whole world is seething with unrest and disaffection. Power politics has become the despair of mankind. This simmering discontent, on a universal scale, is portentous of evil. It is an ominous sign pointing to the dark future. The ruling powers are endeavouring to keep their hold, nay make their grip firmer, under one pretext or the other while the subject masses are fretting and chafing against their chains and are striving to shake off their bondage.

Their strenuous strivings under the imperial regime have so far turned out to be unavailing, but the political awakening concerning their birth-right has come and thus fight against odds has not been altogether an unsuccess. Viet-Minah in Indo-China, Tunisia and Morroco, all that had lain prostrate under the heel of French imperialism have now risen and set themselves on the path to national freedom and liberty. They are facing the usual terrible ordeals of suppression by force of arms and continue to be the victims of ruthless atrocities and wild savagery that would even do honour to the Spanish Inquisition of medieval times; but the spirit once roused cannot be curbed by deadly weapons. The Malayan situation is marked with several insurrections consequent upon a full realisation of the white man's political power and his fraudulent exploitation of the indigenous wealth of matetial resources. The Indonesians who have won through their hard struggle have not yet settled down to

accomplish works of peace. Irruputive and mutinous elements are causing a headache to the people's Government. The Keren rebels in Burma continue dogged in their warfare and guerilla tactics and their frequent clashes with the governmental forces have disturbed the peace of the country. Thailand, too, has a red spot of rebellion aiming at the overthrow of monarchy. Iran by the nationalisation of her oil industry has thrown off the foreign economic yoke. Iraq is also clamouring for an early termination of the pact that still helps the British to retain their domination there. A powerful agitation against the foreigners, which is being engineered by the youth of the country, has recently compelled the Prince Regent to call on the Chief of the Military Staff, General Nurnd-Din Mahmud to assume the reins of government as Prime Minister. He has already installed a strong military Governor in Baghdad.

Egypt has unequivocally disowned the treaty of 1936 and insisted on her complete freedom and the entire evacuation of the British troops from her territory including the Suez Canal zone as well as on the incorporation of the Sudan as its integral geographical part. King Faruq has since July last been sent into exile as a result of an astounding and yet perfectly bloodless revolution in that ancient land of the Pharaohs. A military rule under General Neguib has been established, a rule which is carrying on a drastic purge in all the departments on the one hand while on the other it is introducing sweeping reforms in agriculture, education, and industry. Adil Sashikly, the military dictator of Syria is vigorously pushing on his schemes for the welfare of the masses. General Franco, as everyone knows, is all in all in Spain. Marshal Tito in Jugoslavia wields his power undisputed. Stalin in Russia is the virtual ruler and is busy working out, behind the iron curtain, his plans and projects. Mr. Churchill, well reputed for his pugnacity, is again the leader of Great Britain with Lord Alexander the victor-hero of North Africa who drove before him Field Marshal Rommel and his troops, as his right-hand man in charge of the War Ministry. Across the Atlantic another satellite of Mars has begun to shine on the American horizon. General Eisenhower has been elected the President of the United States. This assemblage of half a dozen military men is a mysteriously curious, nay almost a breath-taking phenomenon. They represent a formidable type. They are each a potential maelstrom. They are giants with indomitable spirits, iron will and steel-frames. They are indefatigable workers, stubborn fighters, and veteran soldiers. They

possess verve and vigour in a preternatural degree. They take decisions and make resolves in a trice and go ahead with them at lightning speed. Nothing can stand in their way, nothing can impede their headlong career over rough and smooth. They have had their schooling in the war theatres. They are accustomed to giving and receiving blows. They stint no stroke in 'foughten field'. They play the game to an end. Before long they must end this cold war of nerves. They must even wade through blood to their goal. They are the arbiters of the fate of nations. They are their living doom Oh! imagination staggers when it pictures them locked up in a life and death struggle like two terribly infuriated wild bisons under whose cloven hoofs the grouud shakes.

The Korean confict has entered into the third year. The Crusades pale into insignificance before this localised war. Excepting the two great World-wars, other wars in history hold but a taper to this sun. Casualties so far reported come up to 5000000 out of which 3500000 falls as a share to the lot of U. N. O. that set out to extirpate aggression. The remaining number can be assigned, by the method of residue, to Korea itself, that unhappy country every yard of which has been blasted and ploughed up. Humanity there has been crushed between the two mill-stones of Democratic Imperialism and Communism into a shapless pulpy mass. The loss of property and institutions is immense and the miseries and sufferings of the panic-stricken and harrassed population untold. Still they know no end. Last year talks to end the war were set on foot but the tardy pace at which the peace parleys proceeded was extremely disappointing. Their chequered career, already characterised by short recoveries and long relapses, came to a standstill. The latter broke down on the question of repatriation of prisnors. The deadlock still continues. Neither of the parties is willing to knuckle under. The impasse remains unsolved, so that the vessel of negotiations must get completely wrecked against this rock. The consequence of it all is that fighting has waxed bloodier at every point, cannonading become more terrific and air raids and bombings have grown deadlier than before. While a good deal of fluent eloquencs is being expended on the termination of hostilities, blood in ill-starred Korea flows on freely. Lord Alexander, the War Minister of Britain, visited the Korean front and said that it was a good experiment. What a grim irony of fate!

Bharat our neighbour across the border presents no satisfactory spectacle. Subversive and underground movements have spread themselves like a virulent disease. Jan Sangh, Mahasabha and Rashtria Sewak

not well for those who dwell in it as it seems ready for another display of fireworks. Both the blocs Western and Eastern are striving hard to outstrip each other in such 'pacific' achievements. General Ridgeway, the Supreme Commander of Western Europe, is busy organising and fortifying his command and can at a moment's notice call his well trained and well equipped army to the stage to give their best performance. America has, with prescience as of a genius, already built her military bases in Greenland, Iceland, and in many an island in the Pacific and Atlantic oceans, while Russia and her allies are not idle on their part and are properly seeing to the 'security measures' with their 200 divisions armed cap-a-pie with the latest and the most effective paraphernalia so necessary for the liquidation of Adam's progeny.

The United Nations Organisation in the midst of such awful preparations, seemed to be the last hope, the last refuge of mankind. But that, too, has failed and failed signally. The actors on its stage strut and fret their hour, and hold the audience spell bound with the recital of tales "full of sound and fury, signifying nothing". It has grown up into a school of clap-trappery and bright hypocrisies of the highest order as befits eminent diplomats of today. Its charter is but charter which lacks the power to shape and mould. The Kashmir question, the racial disabilities of the negroes in South Africa, the affairs of the Arab Asiatic Group, etc, all have so far hung fire and bode no good whatever.

These sponsors of ideological labels, whose vested interests can only thrive and flourish by refining or vulgarising (whatever term you may-choose)nature's forces for rough sport, are planning at top speed to set up a scene of ghastly terrors, bloody horrors, and frightful desolations. They have already tasted blood two times on a world- wide scale and found it so sweet. They would not delay in indulging in another orgy of blood, but perhaps, according to the schedule, the high water-mark of the production of war equipment has not yet been reached. This accounts for the confabulations still going on to enable the prospective participants to attain to the peak before the sirens begin to hoot long and shrill.

Then ensues a frightful scene of blood and fire, horror piled on horror sights hair-raising, blood-curldling, and flesh-harrowing, accompanied by sounds as of the rumblings of an earthquake or the dreadful peals of thunder, with heart-rending wails and cries almost drowned in them, Wild panic drives populaton in all directions to seek shelter in their houses, cellars, subterranean vaults, nooks and corners. Stampede among the herds and animals is greater still. The birds of the air take fright

Sangh are powerul organisations whose ramifications are vast and whose only object is to aid the revival of Brahmanism with its attendant evils of inhuman intolerat ion as well as to obliterate every vestige of Islam. That is the reason why hundreds of communal clashes have occurred since Nehru-Liaquat Pact and the Muslim minority which is already labouring under so many grievous disabilities has been the greater sufferer. At home, in Pakistan, we stand confronted with ghastly famine and starvation owing to acute food shortage chiefly because of the hoarding, black-marketing and smuggling complex. Sectarian fanaticism, masquerading as Islamic ideology, is another disintegrating force that has let itself loose particularly in the Panjab to undo and undermine that national unity which after years of strenuous toil was achieved by the Founder. Oppressive domination and prodigious exploitation and colour bar have even awakened the black nations of the Dark Continent to a sense of their rights as human beings. The Mau Mau movement in British East Africa has become a terror to the English rulers. The racial discrimination introduced by Dr. Malan's Government, in open and brazen-faced defiance of human sanctity, in South Africa, has resulted in a bitter segregation of the white gods from the black groundlings

Armament programmes are not only being extended on an unprecedented scale, but also are being sped up. Factories on both sides of the Atlantic throb and thunder night and day to produce war material of every class and category from the atomic bomb to the small bullet and that, too, of the latest design suggestive of scientific improvement thereon. New weapons are being invented and experimented with, new forces of destruction — the germ bomb, the hydrogen bomb, flying rockets, nay rocket planes, etc— are being discovered and methods devised to manipulate them with a hellish effect and to harness them not to the service of mankind but to that of "ideologies" that idealise away, in no time, the most concrete of realities, namely the former, as if the sanctity of human life were a word without meaning. A British Scientist recently affirmed that the British brand of the atomic bomb was about ten times more powerful and destructive than the one of which President Truman is proud and withal much cheaper, yes far less costly even than an ordinary bomb as by calculation it cost one pound per human victim. And none knows what terrific agency Russia has in store for the night-mared humanity. In view of the extremely dismal prospects the UNESCO President has resigned. The world has become a huge smithy and armoury. It augurs

and fly for life. But columns of dense vapour, dust, and smoke rise all at once and spread themselves, mass on mass, like murky clouds enveloping all in gloom which is shattered by shot and shell. What splendours of ruddy glow! What garish splashes of firy flames, at times multicoloured like a cluster of stars broken loose from the firmament or that of flowers uprooted by, and flying on the wings of, a black storm. Nay it's an exhibition, with a vengeance, of real fireworks of every concievable pattern, of even unimagined design. The howtizers and cannon go 'boom', the batteries hurl their thunderbolts, the shells explode with fury here and there and everywhere, causing sulphurious fires to shoot up and spin. They are flaming whirlwinds engaged in the dance of death. The planes, bombers and fighters, whole squads of them, roar as they swoop down on their prey and soar up with a terrific drone. They whirl and wheel, veer round and return, cut capers and speed straight again, they perform all their antics in varied battle formations. They glimmer and gleam amid clouds of firy smoke, plunge, dodge and dive, and bob up again spitting forth fire all the time and letting loose those deadly missilies-those black cylinders-which play a terrible havoc and mean doomsday for all creatures. They cleave through the array pitted against them, are mixed up in a melee, clash and collide and come down, hurtling and rattling nose to nose, with a frighful crash, turning somersaults amid licking flames. Glistening helmets clang and toss up in the air, burnished bayonets strike and shiver or find their hissing sheath in live lesh. Flash answers flash, The guns, machine-guns, bren-guns are all in action pouring forth their showers of bullets thick and fast like hail, The armoured vehicles, tanks great and small, the artilleries roll and rumble onwards spouting forth cascades of fire and crushing beneath them, nay levelling with the quaking earth fighting units, men women and children, beasts and animals; razing to the ground the dwellings and shelters of the victims ; laying waste parks, gardens, green meadows; setting fire to waving fields of golden corn. The steam-roller of war breaks down all barricades and blockades and paves its way with human flesh and bones. The soil is sodden red with gore. The ground in consequence of incessant pounding is honey-combed as far as the eye can see. Bridges and acqeducts, roads and railway lines are blown up. Communication centres, factories and armouries, stores and depots, are smashed into splinters. Telephone and telegraphic wires are cut, pulled down and they lie fallen across the country side; barbed wire fences and poles are uprooted and dismantled. In such a fierce

blast nothing can stand and survive. Sky-scrapers, steeples, pinnacles, spires, domes, towers and turrets, temples, theatres, churches, palaces, yes, the White Houses, State Buildings, Windsor Castles, Old St. Pauls', Notre-Dames, the Louvres, Palaces-de-Versailles, the Kremlins, sublime monuments of architecture and magnificent marvels of engineering skill, all ablaze, tumble and topple down into one whole mass of burning ruins Thebes, Ninevah, Tyre, Babylon in ancient times fell when the fury of man joined with the fury of God and were effaced from the face of the earth as if they had never existed, grown, flourished and made noise in the world. In our day when the 'orange cloud' rises with a glare, hundred times more dazzling and blinding than that of the sun, London, Washington, New York, Paris, Moscow etc., are wiped out completely, thanks to the genius that discovered the stupendous energy of the atom and that sinister force which emanates from the breaking up of its nucleus, an agency that makes no long while causing solid masses to evaporate. Man's ingenuity is capable of even achieving greater holocausts than the atomic one.

Human flowers full-blown, half-blown, buds folded and half unfolded, sprigs, shoots, sprouts, all shrivel and crumple up amid such fireworks. Here lies a chubby baby-boy half blasted, a rose among the blasted roses, there rests in eternal innocent peace, though with eyes glazed and a doll clasped still to her bosom, a baby-girl on a blighted bank of lilies. Corpses, corpses everywhere; dead bodies of soldiers, volunteers, men, women, children of all ages, on the plain, in the ponds and streams, red with blood, trenches, pits and ditches and moats, ravines and gorges, woods and forests, along the roads and tracks, in the sheds, amid ruins and enclosures, streets and lanes, under the enormous heaps of debris, horribly mutilated and mauled, lying sprawled or half buried or dangling over wires, amid branches, impaled on bayonets and spikes of fences, headless trunks, trunkless heads and limbless stumps, mangled and maimed, with swollen tongues hanging forth and eyes caverns of darkness, the glittering teeth wearing their grim sneer in mockery of life. Mute inglorious Miltons and village Hampdens, Grace Darlings and Florence Nightingales are silenced for ever, "unwept, unhonoured and unsung." When this scene of crimson carnage is over, when populations have been decimated, nay blotted out of existence, when they have met their quietus in the midst of such 'quiet', it is bloody ruin and wild desolation all around. The eyes get seared to see such horrid sights, as if it were a maddening

nightmare.

The carcases of beasts and animals, dead domestic pets, birds and fowls present a spectacle no less ghastly. They lie scattered everywhere in weird postures, with whole parts blown up or windowed and bored. In short, all creatures are "in one red burial blent." Man-blown blizzard knows no distinction; it converts human habitations into charnel houses. The survivors, mostly orphaned children, old men and women mourn and lament pitiably the ruin of sweet homes and cold hearths. Young widows and maidens utter stifled groans under the white terror of rape and rapine Man in his presumptuous and self-assumed role of the keeper of the conscience of man often makes wildwork of himself.

When the dusk gathers round, night prowlers, thieves, robbers, felons, and pickpockets, if they have survived at all such a wholesale operation, emerge from their coverts and go about their 'honest' business. They seek to lighten the burdens of the dead and the dying to ease their passage to eternity and dispossess them of their valuables, gold and silver lockets and chains, purses, wrist watches, lighters and cigarette cases, rings and necklaces, knives and fouutainpens.....They tread upon the dead bodies and broken scalps, bend over them; they probe and feel, turn them over, extract their treasures and trophies and disappear at dawn after gratifying their lust for plunder.

Death has tripped his fiendish measure that has caused hundreds of thousands of human beings to measure their length on the bosom of Mother Earth and now should be held a feast, the invitees being the ravens, vultures, kites, dogs, jackals, hyenas, etc. It's a windfall for them all: a golden hour when they can gorge themselves to satiety. They fasten their fangs, beaks and claws into the flesh and gnaw and tear every lump of it from the bones and make a hearty meals, leaving the skeletons to rot and putrify in the sun during the day and in the dews at night and thus to engender epedemics with the help of their poisonous exhalations and pestilential miasma, as if such a finale to the gruesome tragedy enacted by man were needed still by way of consumation. In case the dead outnumber those who make voracious inroads upon them, and the supply far outdoes the demand, they are dumped up into a pyramid which is set ablaze. The bonfire is a fitting match in resplendence for the 'glories' of cannonade and aerial bombardment. They even boil down the human bodies in huge cauldrons, if not for the utilitarian purpose of manufacturing fat, as popular report says, at least for the liberal satisfaction of sweet revenge. The vanquished have ever afforded this gloating pleasure to the victors.

Only the Sphinx of the Future knows whether the powers that be have in store for the tortured humanity flowers which confer peace and plenty or fireworks which blight and blast.

A. Hessen

The Greedy Jagirdar

1 The Autumn and Winter had been so good,
That in spring the corn was growing in woods;
'Twas miserable to see everywhere,
The grain lie rotting without any care,
But then it was rationed as you would see,
Nobody could get it to the entire degree.
Every day the starving folks,
Crowded around the Jagirdar's door,
For he had a plentiful of the last year's store,
And everyone could readily say
His farms were full as they were alway.

2 At last the Jagirdar appointed a day
To quiet the folks without delay.
He asked them to his store to come
And have their share one by one.
Rejoiced at such good news to hear,
The poor folks flocked from far and near,
When the hall room was full as it could hold,
The women and children and men so old,
The Jagirdar saw they were more than a score,
He signalled to his gentry at the door,
And while for mercy on God they called
They were baton-charged and thrown out of the hall.
I'd guess this is an excellent sight,
To quit the country of its useless might,
And then to his magnificent palace he returned
As if nothing had ever happened.
Now as he spread his stately arms
A man came running white with alarm.
"My honour, I opened your granaries this morn,
And the rats have eaten all your corn."

3 Another herald came in running soon,
His cheek was pale as in a swoon,

" Fly good sire, fly away,
And quit this palace without delay,
For thousands of rats are coming this way,
God have mercy on you this day."
" I'll go to my palace on the mere," said he,
' Tis the safest place in this country.
The walls are high, the shores are steep,
The current is strong, and the waters deep",
The Jagirdar finally hastened away
And reached the palace without delay.
When inside he room the barred the doors,
He lay on his bed and awfully snored.
He had, however, not slept very much
When he heard the rumblings of the onward rush.
An army of rats came up the bent
To do the work for which they were sent.
They were not in numbers of dozens and scores,
But in millions and billions and many times more
Such numbers have never been heard before,
Since Attila the Hun on Europe's shore.
They gnawed the flesh from the Jagirdar's limbs,
For they were sent for judgement on him.

A child was hearing about wars and asked his father how they began.

Father (stating to explain): "Suppose America quarrelled with England——."

Mother (interrupting). "England and America aren't quarrelling."

Father : "I know, but this is a hypothetical instance."

Mother : "But you are misleading the child."

Father : "No, I'm not."

Mother : "Yes you are."

Father : "I tell you I'm not. It's an outrage the way you....."

Child : "Never mind, Dad, I think I understand now."

N. D. Ahmad

Re-appear

DON'T be inquisitive ! What does this odd title signify ? Rest assured this does not mean that you are to reappear in your exam. (Degree students, please don't take it ill). I have the least in my mind those, who reappear in the hostel-mess, particularly when there is a "dish". (Hostellers excuse me.) At least I am not guilty. It is an appeal to you to change your outlook and shake off the evils of the social system. Think for a moment that you are all reappearing. Mind you, common loss, is no loss, but common gain.....I doubt. Who will dispel my doubt ?

It is a natural effect of our climate that we have acquired tendencies to be slothful and ease-loving. The usually-held view that happiness seldom comes to man may be true. But I find that the problems facing us to day are rather more complicated, acute, and intriguing.

The first source of malady, according to my observation, is the lack of proper understanding of others. We may be knowing a person or not, but if somebody talks something obscure about him, we lend a ready ear and confirm his findings without deeply inquiring into the source from which they emanate. What heightens the tragedy is the fact that such a story spreads like wild-fire and what sort of repercussions it has on the minds of those, who listen to it, can be easily imagined. It seems as if someone had sapped our capacities of dispassionate thinking, of scientific and rational outlook and sound analysis. To a certain extent I feel this can be achieved by setting up a certain standard of conduct. Supposing A abuses B's position or parades some of his weaknesses, he should have the sense to realise that his brother C would strongly disapprove of his conduct. If we achieve this sort of co-operation among ourselves, we are sure to get rid of this evil.

To discover a system for the eradication of impostures is a vital need of our civilization. We often have a pleased satisfaction that, by applying some tactics, we have

befooled a certain individual, but never try to notice how much our conscience disgusts us. We hesitate and sometimes fear to hear some true version of a fact, because we feel it to be devoid of delectation, just as Bestrand Russel says

> "Truth however is not always interesting and many things are believed because they are interesting although in fact there is little other evidence in their favour".

But can't we think of some other ways of enjoyment ? I think, we can.

Party-politics and factionalism are considered as the virtues of modern times. Have you ever analysed this problem, bearing well in mind its pros and cons ? If we don't make a sincere attempt to accomodate others' viewpoint and if we are veering round the views of wrong friendships, have little regard for merit and fail to submit everything to the scrutiny of our own senses and our own mind, then we are surely prostituting ourselves to these sinister tendencies. Do we wish to be called dumb-driven cattle ? The misfortune is that the educated section of the populace is the most addicted to it.

To serve one's own ends at the expense of the community or the nation is something which requires emphatic and unequivocal condemnation. A westner even goes to the extent of telling a lie to properly protect and safeguard the honour of his nation. He may suffer a loss, but his community must not. We can also dispense with such a nefarious activity. if we are determined to raise the standard of our conduct. If we find that personal considerations are smuggled in, where a national issue is involved, we should be bold enough to award an exemplary punishment in whatever form it may be to such an individual.

It appears to us something difficult and troublesome to give up long formed habits. We hate a person who reminds us of our shortcomings, examines and exposes what we profess and do not practise. Why is it so ? Let us try to reconsider our attitude.

I narrate here a story which reflects the tendencies of our social system. To a smaller extent it will relieve you from the strain the preceding portion of the article may have imposed upon you. A candidate aspiring for the post of a press-attache came in for the ordeal before the Pakistan Public Service Commission. He had stated that he knew French. On being asked he confessed he did not know a word of it.

> "But how is it that you have stated in your application that you know French ?".
>
> "Sir, I thought you would at least take a year to call me for an in-

terview".

"That's funny" remarked the Chairman, "Do you think the Government to be so incompetent as that ?"

"Well, Sir, I don't know.....but I have heard....."

"Alright, alright, that will do. Thank you," the Chairman rejoined and drew the curtain down. What sort of opinion have you got for such a person ? Do you think he was a lunatic, and answered the questions in a fit of insanity, or it has a direct bearing on the social system in which he moved ? Indeed the courses of various kinds of irrationalities lie partly in our social system and partly in the individual psychology, which of course, itself is to a considerable extent the product of that social system.

Criticism in its healthy sphere is good and must be encouraged. But to find fault with someone's effort, without making suggestions of one's own to improve the situation is a disease which must be exterminated.

We also lack moral courage. In the course of a talk, which I had with a friend of mine, who had returned from the United Kingdom, I was told of the moral courage with which those people are endowed. Speaking particularly about the student community, he made the observation, and I have every reason to believe that not a single case remained undetected. People there, he said, sometimes were guilty of some very serious offences, but never hesitated to reveal their identity when called upon to do so. If at all any of them tried to hide himself under some cover he was unable to do so due both to the enviroment and the moral pressure of society.

Pilfering is another curse which has prodigously impaired our moral energies and indeed this is the disease which appears in some quarters to be incurable. I wonder if it is so ? May I remind you of the talk of our worthy Principal, which he gave to the students ? Talking of his study-career at the Oxford University he said that students proceeding home in the long vacation left every-thing as it was, and never cared to lock the doors of their rooms. On their return, they found every-thing in its own place. Dr. Bashir Ahmad, Vice-Chancellor and Director University Institute of Chemistry, I remember, once proposed that students should not lock their shelves containing the practical apparatus. He made the suggestion after a recital of his impressions of the foreign universities. But who was there to guarantee that there would be no loss of a single test tube ? The tendency is to use heavier locks than those which can be easily broken.

It is really strange why we people have fallen a prey to such mal-

practices, and is indeed astonishing to note why we hesitate in living up to our professions. At a stage when we have little regard for religion and its commandments and are progressing in such a social system as we find to day, obstructionist and unscruplous forces are sure to loom large over our minds. Mental see-saw coupled with an absymal ignorance of religious doctrines is not only detrimental to, but also likely to affect, our social life adversely. Indeed we require an evolution (not revolution, mind you, I am not a communist) in our social system. To achieve this end continuous and sustained efforts are required. Let every one from among us resolve to face these evils squarely and to realize our duties as young educated men of a free nation.

Hameed Ahmad
IV Year

How to Read

THE function of reading, like most of the functions in the body, may be normal or abnormal. In the light of our present knowledge of the anatomy and physiology of the eye, there are many things which formerly thought to be harmful to the eyes, are now considered to be actually beneficial. For example fine print used to be considered bad for the eyes. Though, these days, we have larger, better print, blacker ink, whiter paper and finer illumination to read in, yet the number of people who feel discomfortable when they read is increasing rapidly. The only answer to this is that we need a better way of looking and not better things to look at.

Most people form bad reading habits thus:

i). By reading the book too near or too far away.

ii). By keeping the body in a strained and uncomfortable posture.

iii). By reading in insufficient or too much light.

iv). By reading when nearby objects reflect very bright light so that they come within vision and the eye may not be focussing there.

v). By reading when one is sick or very tired.

vi). By reading when one ought to have gone to sleep.

vii). By reading when one is tense from hurry or fear or worry.

viii). By straining to read blurred or poorly printed material.

ix). By squinting with the eyes half closed in order to see better.

x). By reading from a highly glazed paper. Such a paper causes the eye strain when it is not properly illuminated and in direct light its glare fatigues the eye.

xi). By reading when one is in a train or in an automobile. In this case the print cannot be possibly held stationary.

xii). By reading from an unmatched colour paper.

The eye can be trained in a normal way if we read a book in the following manner:

1. Always sit in an upright and relaxed position so that no organ or tissue has undue pressure or tension.

2. The head should be nearly upright also. It may be inclined slightly but not too much, because in the latter case the muscles and tissues of the neck would be under constant pull affecting the nerve centres in the brain due to insufficient circulation of blood and the nerve centres control the eye functions.

3. The book should be held 14 to 16 inches from the eyes and close to the body so that the arms rest against the body. The eye-lids should be slightly parted and relaxed. The blinking should occur once or twice to each line. Blinking does not in any way interrupt the vision.

4. Adequate light must be used so that a slightly stronger direct light falls on the book, the light being placed to the back and at one side so that reflection of light from the book does not strike the eyes which produces retinal fatigue. No bright objects should be placed in the field of vision.

5 Read each word in proper sequence. Don't make haste to go ahead. If a whole sentence or an entire line is noticed, at a glance, as in skimming through a page, strain, which is the cause of all refracting errors in the eye, is produced. First understand what is read and then proceed on. He who reads an average book in an hour or two is abusing his eyes and is bound to have trouble with them sooner or later. If you are not interested in a paragraph or a chapter leave that altogether or read every word, because skimming over a page is always harmful. Skimming causes a partial focussing which results in the loss of the ability to produce a complete focus and hence a dim or blurred vision.

6. All functions, whether of the body or of the mind, are performed through the use of nervous energy. In normal functioning the amount of energy consumed is small. When the nervous system is exhausted through either sickness or lack of sleep, it is far better to omit reading altogether or to omit it as much as possible. To one reading may be a relaxation as compared with most of one's other activities, yet it is no substitute for sleep and absolute rest.

To recapitulate:— To read to the best advantage, follow these suggestions :

1. Sit properly.

2. Hold the head balanced over the body, i.e., not hanging forward.

3. Hold the book up towards the eyes, not lazily place it in the lap. Fourteen to sixteen inches is the proper distance for reading.

4. Arrange the light. Have plenty of light without glare or bright spots to tire the eyes.

5. Read easily and deliberately, word by word. Do not scan and skim. In this manner, you train your eyes to act normally when they read, and to avoid acquiring abnormal activity.

6. Read only when you feel able. When you are sick or tired, the eyes, too, are sick and weary and need rest. So pay due attention to them.

7. Blink once or twice to a line and avoid staring.

(Adapted)